مشتاق احمد یوسفی کا فن

معصوم مرادآبادی

Z-103، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔110031، موبائل: 9810780563

''جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے تنگ ہونے اور مرد چارپائی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں چارپائی صرف میزانِ جسم ہی نہیں بلکہ معیارِ اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو کندھا دینے والے چارپائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دبلے آدمی کی دنیا اور موٹے آدمی کی آخرت عام طور سے خراب ہوتی ہے۔'' (چراغ تلے)

ایسا دلچسپ اور پُر لطف مزاح لکھنے والے ادیب مشتاق احمد یوسفی گزشتہ دنوں ہم سب رخصت ہوگئے۔ اردو شعر وادب پر یہ کیسا پیمبری وقت آن پڑا ہے کہ سارے مشاق لکھاری یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ جتنے چراغ تھے، وہ سب بجھتے چلے جارہے ہیں اور تاریکی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یوں تو ہر ادیب اور قلم کار کی موت علم وادب کا خسارہ ہوتی ہے، لیکن ان میں بعض لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے دنیا سے اٹھ جانے کا غم سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ہمارے ان گنے چنے قلمکاروں میں سے ایک تھے جن پر اردو کو ناز تھا اور جنھوں نے اپنی بے مثال طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں سے اردو کے خزانے کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے زبان وبیان کو بلندی تک پہنچایا۔ یوسفی صاحب کی رسائی اردو نثر کی معراج تک ہوئی۔ انہوں نے طنز ومزاح کے حوالے سے جو اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا ہے اسے عالمی ادب کے سامنے فخریہ طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کو محض طنز ومزاح نگار نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کے ایک ایسے نباض ہیں جنھیں اپنے فن پر پورا کمال حاصل ہے۔ ڈاکٹر خاور ہاشمی کے لفظوں میں:

''مشتاق احمد یوسفی کو محض مزاح نگار اور طنز نگار ثابت کرنا دلیلِ کم نظری اور اس کے فن کو ایک جوئے کم آب بنا دینے کے مترادف ہے۔ وہ انسانی فطرت اور نفسیات کا نبض شناس ہے۔ مصورِ فطرت ہے۔ اپنے قاری کے رگ وپے میں روح بن کر سما جاتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے رُلا دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے۔ پڑھنے والا نہ آنسو روکنے پر قادر ہے نہ قہقہے روکنے پر۔ آنسوؤں اور قہقہوں سے ہی زندگی کے عنوان بنتے ہیں، اس کے مفہوم نکلتے ہیں۔ یوسفی کے یہاں علم ومشاہدہ یکساں وسیع اور ہمہ گیر ہیں، متوازن ہیں۔ علم مشاہدے کے بغیر اور مشاہدہ علم کے بغیر ہو تو شاہکار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ خونِ جگر پیدا نہیں ہوتا جس سے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ اسے پڑھ کر زندگی کی برکتوں اور عظمتوں کا احساس وعرفان تازہ وتوانا ہوتا ہے۔ یوسفی کو پڑھ کر ہزار شیوہ زندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اس کے پاس طنز کے تیر ونشتر بھی ہیں اور ایک سنجیدہ مزاح بھی۔''

(ادب اور قومی زندگی: مصنف ڈاکٹر خاور ہاشمی، ص: ۵۸)

بلاشبہ یوسفی صاحب کی تحریروں کا سب سے بڑا ہنر ان کا مشاہدہ اور سماجی مطالعہ ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر ادیبوں سے ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں۔ وہ عام سماجی زندگی کے روزمرہ واقعات کو اس طرح اپنی تحریر میں پروتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس میں ناقابل بیان لطف محسوس ہوتا ہے۔ انسانی سماج اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو یوسفی صاحب کے مشاہدے کی حد سے پرے ہو۔ انسانی فکر وفہم کا کوئی زاویہ، نفسیات کا کوئی نکتہ یوسفی صاحب کی گرفت سے باہر نہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی بات کہنے کے لیے جس زبان وبیان کا سہارا لیا ہے اور جس طرح مختلف موضوعات کے بیان میں اس موضوع کی باریک سے باریک جزئیات کو قلم بند کیا ہے، وہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسفی صاحب کی دلچسپ اور دل آویز تحریروں پر لوگ بے تحاشہ سر دھنتے نظر آتے ہیں اور ان کے خوبصورت جملوں اور پیراگرافوں کو دہرا کر محفلوں کو

زعفران زار بناتے ہیں۔ عام طور پر لوگ محفلوں میں اچھے اشعار سنا کر حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں، لیکن یوسفی صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے برجستہ اور نوکیلے جملے محفلوں کو قہقہہ زار بنانے کے کام آتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو ان کے جملے ہی نہیں بلکہ پورے پیراگراف اور بعض کو تو ان کے مضامین یوں یاد ہو جاتے ہیں جیسے امتحان میں بچوں کو اپنا سبق۔ ان کے چاہنے والوں اور ان کی تحریروں پر جان و دل نثار کرنے والوں نے یوسفی صاحب کے خوبصورت اور دلنشین جملوں سے نہ جانے کتنی محفلوں کو زعفران زار بنایا۔ ان کا ہر جملہ ایک ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جسے بڑی مشقت اور دیدہ ریزی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب فلم ساز کے۔ آصف چھٹی دہائی میں اپنی شہرۂ آفاق فلم 'مغل اعظم' بنا رہے تھے تو اس کے ایک ایک ڈائیلاگ پر گھنٹوں سر کھپایا جاتا تھا۔ کے۔ آصف کے ساتھ کمال امروہی، امان اللہ، احسن رضوی اور وجاہت مرزا ایک ایک ڈائیلاگ کی ساخت اور اس کی خوبصورتی پر غور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 'مغل اعظم' کے ڈائیلاگ ہماری فلم انڈسٹری میں سب سے زیادہ مقبول ہیں اور اکثر لوگ انھیں دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اکیلے ہی اپنے ذہن سے ایسے حسین اور خوبصورت جملے تراشتے تھے کہ پڑھنے اور سننے والے ان سے دیر تک لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ مشتاق احمد یوسفی سے قبل یہ ہنر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن اور ابن انشا کو نصیب ہوا تھا۔ یوسفی صاحب کے ہم عصروں میں یہ کمال مشفق خواجہ کے ادبی کالم 'سخن در سخن' میں نظر آتا ہے، جو وہ خامہ بگوش کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ یوسفی صاحب کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی ان کی برجستگی ہے، وہ بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر سب سے زیادہ جانتے تھے اور ایسی کاٹ پیدا کرتے تھے کہ پڑھنے والے سر دھنتے نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے بقول:

> ''یوسفی کا طرز بیان سرتاسر ادبیت، ذہانت اور برجستگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ بات سے بات پیدا نہیں کرتے بلکہ بات خود ان سے کہلوا کر ایک طرح کی طمانیت اور فخر محسوس کرتی ہے۔''

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے ان کی کتاب 'خاکم بدہن' کے فلیپ پر یہ تاریخی جملہ تحریر کیا تھا کہ ''ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔'' یوسفی صاحب کے فن پر ڈاکٹر ظہیر فتح پوری کا یہ جملہ اتنا مشہور ہوا کہ ضرب المثل بن گیا۔ مشتاق احمد یوسفی کے انتقال کو بیشتر ادیبوں اور دانشوروں نے عہد یوسفی کے خاتمے سے تعبیر کیا ہے۔ روزنامہ 'جنگ' نے ''عہد یوسفی کا خاتمہ؟'' کے عنوان سے اپنے ادارتی نوٹ میں تحریر کیا ہے:

> ''کہا جا رہا ہے اردو ادب کا عہد یوسفی ختم ہو گیا، مشتاق یوسفی انتقال کر گئے۔ بجا کہ خالق دو جہاں کے وعدے کے مطابق ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ بہر طور چکھنا ہے۔ تاہم جسمانی موت خیالات و افکار کو بھی لقمۂ اجل بنا دیتی ہے، یہ بات غور طلب ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سقراط سے لے کر غالب تک کب کے فراموش کئے جا چکے ہوتے۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مشتاق یوسفی انتقال کر گئے، عہد یوسفی موجود ہے اور تب تک رہے گا جب تک پھکڑ پن اور لغو مزاح کے بجائے شائستہ اور شگفتہ مزاح پڑھا جاتا رہے گا۔'' (جنگ ۲۱ر جون ۲۰۱۸ء)

حقیقت یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے پس مرگ جو سرمایہ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑا ہے، وہ انہیں تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کے قارئین کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ چونکہ انہوں نے جن سماجی ناہمواریوں کی طرف اشارے کئے ہیں ان میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ جس قسم کی مرصع اور معریٰ نثر لکھتے تھے اس کو سمجھنے والوں کی تعداد اگرچہ ہمارے معاشرے میں کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور عہد حاضر کے مزاح میں شائستگی اور شگفتگی کی جگہ پھکڑ پن نے لے لی ہے، لیکن جو لوگ ہمارے تہذیبی، تاریخی اور سماجی ورثے سے واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے یوسفی صاحب کی تحریریں اتنی دلکش ہیں کہ انہیں بار بار پڑھنے کے باوجود پڑھنے کی خواہش باقی رہتی ہے۔ یوسفی صاحب ہمارے معاشرے کے ایک زبردست نباض تھے۔ انہوں نے ہماری تہذیبی، تاریخی اور سماجی زندگی کے پیچ و خم کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ انہیں دیکھ کر رشک آتا تھا۔ روزمرہ کے امور کو سمجھنے اور انھیں اپنے مخصوص پیرائے میں بیان کرنے پر انہیں جو قدرت حاصل تھی اس کی ہمسری کوئی نہیں کر سکا۔ ہمارے عہد کے ایک معتبر اور مقبول مزاح نگار عطاء الحق قاسمی نے انہیں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

> ''مشتاق احمد یوسفی نے ۹۷ برس ہمارے ساتھ گزارے اور ہنستے ہنساتے رہے مگر ان کے ہنسانے اور میرے ایسے کے ہنسانے میں بہت فرق تھا۔ ان کی مزاحیہ تحریر میں گہری معنویت ہوتی تھی۔ میں پہلے دن سے ان کا قاری تھا مگر عاشق 'آب گم' پڑھ کر ہوا۔ جب میں نے ان کی یہ کتاب پڑھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے ادب کے کس خانے میں رکھوں۔ کیا یہ سرگزشت ہے، کیا یہ محض طنز و مزاح ہے، کیا یہ خاکوں کی کتاب ہے، کیا یہ

کوئی ناول ہے اور یا یہ کسی مفکر کی تحریر ہے جو کائنات کے اسرارورموز پر غور کرتا رہتا ہے کیونکہ 'آب گم' میں ان تمام اصناف کے اجزا موجود تھے۔ میں اس وقت بھی حیرت زدہ رہ گیا جب میں نے کراچی کے پسماندہ ترین علاقوں کی تصویر کشی اس میں دیکھی، لگتا تھا کہ یوسفی صاحب نے ساری عمر شاید ان ہی جگہوں میں بسر کی ہے جن میں دروازوں کی جگہ ٹاٹ کے ٹکڑے لٹکائے گئے ہوتے ہیں۔ مجھے اس حیرت کا سامنا قرۃ العین کو پڑھتے ہوئے بھی ہوا۔ ایک بڑا ادیب ہر طرح کی زندگی بغیر تجربے کے گزارنے کا اہل ہوتا ہے۔''

('جنگ' ۲۳؍جون ۲۰۱۸ء)

سچ پوچھئے تو یوسفی صاحب جب لکھتے تھے تو ان کی تحریر میں متعلقہ موضوع کے سارے اسرارورموز پنہاں ہوجاتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک مضمون لکھنے سے پہلے برسوں اس موضوع کا گہرا مطالعہ کیا اور اس تجربے کو اپنے وجود پر گزرنے دیا تاکہ وہ جو کچھ لکھیں ہمیشہ کے لئے امر ہوجائے۔ آپ ان کی کوئی ایک تحریر بھی ایسی نہیں دکھا سکتے جس میں کوئی جھول ہو یا کوئی جملہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کمزور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایک ایک جملے پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ شاعری میں تو یہ روش عام ہے کہ لوگوں کو اچھے شعر خود بخود یاد ہوجاتے ہیں، لیکن عام طور پر لوگ کسی شاعر کا ایک شعر یا ایک غزل ہی یاد رکھ پاتے ہیں۔ یوسفی صاحب کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے پورے پورے مضامین لوگوں نے حفظ کررکھے ہیں۔ انہوں نے مزاح کے عمل کو اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام دیا تھا۔ بقول خود:

''عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ، لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو وہ پھر راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔''

بلاشبہ یوسفی صاحب نے تمام عمر راکھ کو ہیرا بنانے کا کام کیا کیونکہ وہ اس ہنر میں طاق تھے۔ کوئی ۶۰ برس کے اپنے علمی اور ادبی سفر میں انھوں نے کل پانچ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور ان کی ہر کتاب ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ نصف صدی سے زیادہ کی تخلیقی زندگی کا حساب لگایئے تو انھوں نے بہت کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کندن کی طرح ہے۔ ساٹھ برس کے اپنے ادبی سفر میں 'چراغ تلے' سے لے کر 'شام شعر یاراں' تک ان کی کتابوں کی تعداد محض پانچ ہے۔ ان کی آخری کتاب 'شام شعر یاراں' جو تمام کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس سے ۲۵ برس قبل انھوں نے 'آب گم' لکھی تھی یہ ان کی کتابوں کے درمیان سب سے بڑا وقفہ ہے۔ ان کی آخری کتاب پہلی چار کتابوں سے قطعی مختلف ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ ان کی آخری کتاب جوان کے منفرد اسلوب کے معیار پر کھری اترتی ہے، وہ دراصل 'آب گم' ہی ہے اور اسی پر ان کے ادبی سفر کا اختتام گردانا گیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والی ان کی پہلی کتاب چراغ تلے کے گیارہ ایڈیشن شائع ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں 'خاکم بدہن' کے ۱۴ ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ یوسفی صاحب کے یہاں تعداد کے مقابلے میں معیار کی اہمیت ہے۔ ان کی آخری کتاب 'شام شعر یاراں' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مشہور ادیب اور شاعر امجد اسلام امجد نے لکھا تھا:

''شام شعر یاراں یوسفی صاحب کی پانچویں کتاب ہے۔ اس سے قبل چراغ تلے خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم کے نام سے ان کی نثری تحریروں کے چاروں مجموعے طنز ومزاح کے حوالے سے اردو ادب کے کلاسیک کا درجہ حاصل کرچکے ہیں۔ وہ افتادِ طبع کے باعث ایک Perfectionist واقع ہوئے ہیں۔ سو وہ کسی تحریر کو چھپوانے سے پہلے اتنی بار اس پر 'نظر ثانی' کرتے ہیں جس کا شمار ممکن نہیں۔''

یوسفی صاحب کی تحریروں کا سب سے بڑا حسن ان کا مشاہدہ ہے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس موضوع کی باریک سے باریک جزئیات کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں کوئی جھول نہیں ہے۔ ایک ایک جملہ اتنا نپا تلا اور مکمل ہوتا ہے کہ اس پر کوئی گرہ نہیں لگائی جاسکتی۔ اپنے تجربات اور مشاہدات کو بیان کرنے کا ان کا انداز اتنا نرالا اور منفرد ہے کہ کوئی بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکا۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے ان کے فن اور مشاہدے کو ان الفاظ میں پرویا ہے:

''مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت میں ظاہری تعلیم کے علاوہ تہذیبی رچاؤ بھی شامل تھا، ایسے میں قدرت نے انھیں مشاہدے کی بے مثال قوت، گہرائی تک چیزوں کو محسوس کرنے اور انہیں جداگانہ انداز میں بیان کرنے کی صفت سے سرفراز کیا۔ ظاہری اور باطنی خوبیوں نے مل کر انہیں ایک ایسا شاہکار بنا دیا جسے دیکھنے والی آنکھ سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کئی بار تحریر اور شخصیت میں فرق ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا تن من مزاح کی چاشنی اور خوبصورتی سے مزیّن تھا۔ مزاح ذہانت سے گہری جڑت

رکھتا ہے۔ مزاح لکھنے والا فطین اور لطافت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔ ایک کند ذہن یا اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والا پھکڑ مذاق اور جملے بازی کر کے وقتی طور پر ہنسا سکتا ہے، مگر روح کی بشاشت، دل کی آسودگی اور فکر کے در نہیں کھول سکتا۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تحریروں میں معاشرے کی تلخ حقیقتوں، بے انصافیوں، طبقاتی تفریق اور سماج میں پھیلے مختلف ناسوروں کے علاوہ ہماری چھوٹی چھوٹی حرکتوں، خواہشوں اور ردِ عمل کے پسِ پشت کارفرما جذبوں کو دلنشیں انداز میں بیان ہی نہیں کیا بلکہ ان کی حقیقت عیاں کی ہے۔ ان کا فقرہ صرف ہنساتا نہیں جگاتا بھی ہے۔ سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے اور معاشرے کی اصلاح کی طرف راغب بھی کرتا ہے۔ وہ جتنا ادب تخلیق کر کے گئے ہیں وہ کئی نسلوں کی حسِ مزاح کو نکھارنے اور زندگی کو جگمگانے کے لئے کافی ہے۔''

عام طور پر اردو میں مزاح نگاری کو دوئم درجے کے ادب سے تشبیہ دی جاتی ہے اور اسے تفریحِ طبع کا معمولی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ادب کے ناقدین نے ہمارے مزاح نگاروں کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا، لیکن مشتاق احمد یوسفی کا معاملہ سب سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنے فن کی بلندیوں کو چھوا ہے۔ ان کے تخلیق کردہ ادب پاروں کو کسی بھی زبان کے اعلیٰ فن پاروں کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان کی زبان و بیان ہی نہیں انوکھی لفظیات اردو ادب کے خزانے میں ایک اہم اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے مشتاق احمد یوسفی کی اس خوبی کا برملا اعتراف کیا ہے:

''طنز و مزاح نے تو مشتاق یوسفی کی تحریروں میں انتہائی عروج کی منزل طے کر لی۔ عہد جدید کی دین ہے ہمہ جہتی انداز۔ ذرا سی بات میں نت نئے پہلو پیدا کرنا اور اس کے ذریعے ہر سمت میں تخیل کے دروازے کھولنا، یہی کیفیت ہے مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کی جنھیں صرف مزاح نگاری کے ضمن میں رکھ کر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں آگہی اور بصیرت ہی نہیں ادبی اسلوب کی رمز شناسی اور تہہ داری بھی موجود ہے۔''

یوسفی صاحب کے جملوں کی کاٹ ایسی ہے کہ اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ اپنے جملوں کو رگڑنے اور ان کی نوک پلک درست کرنے میں سب سے زیادہ وقت صرف کرتے تھے اور اپنے مزاح کی برجستگی پر ذرا سا بھی حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کے یہاں تحریر کا جو سلیقہ ہے وہ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں۔ وہ اردو ادب میں اردو نثر لکھنے والوں کی پہلی صف میں شامل ہیں بلکہ بعض احباب نے تو انھیں غالب کے بعد سب سے اچھی نثر لکھنے والا ادیب قرار دیا ہے۔ وہ ایسے جملے تراشتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستا بھی رہے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس بھی ہوتا رہے۔ وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ آئندہ نسلوں تک ہمارے ساتھ جائے گا۔

ان کی یادگار تحریروں سے لیے گئے چند بے ساختہ جملے ملاحظہ ہوں:

- بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں، سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے۔
- پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔
- دشمنوں کے حسب عداوت تین درجے ہیں: دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔
- مسلمان کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔
- آدمی ایک بار پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔
- مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں، مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انھیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔
- مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔
- لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید ہمیشہ سچائی ہوتی ہے۔
- جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔
- حجام کی ضرورت ساری دنیا کو رہے گی تاوقتیکہ ساری دنیا سکھ مذہب اختیار نہ کر لے اور یہ سکھ کبھی ہونے نہیں دیں گے۔
- امریکہ کی ترقی کا سبب یہی ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہیں۔
- محبت اندھی ہوتی ہے، چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں، بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہوتا ہے۔
- فقیر کے لیے آنکھیں نہ ہونا بڑی نعمت ہے۔
- گالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ اپنی مادری زبان ہی میں مزہ دیتا ہے۔

- سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غربا منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں
- ہارا ہوا مرغا کھانے سے آدمی اتنا بودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات درست لگنے لگتی ہے۔
- مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی، الجھن دور ہو جاتی ہے۔
- جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نہیں نصیب ہوگی۔
- انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔
- یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو، اتنا ہی چمکتی ہے۔
- آسمان کی چیل، چوکھٹ کی کیل اور کورٹ کے وکیل سے خدا بچائے، ننگا کر کے چھوڑتے ہیں۔
- بدصورت انگریز عورت نایاب ہے، بڑی مشکل سے نظر آتی ہے، یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی سے شادی کرتا ہے۔
- ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے، جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔
- آپ راشی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش اخلاق، ملنسار اور میٹھا پائیں گے کیونکہ وہ نخوت، سخت گیری اور بدمزاجی افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔
- فرضی بیماریوں کے لیے یونانی دوائیں تیر بہدف ہوتی ہیں۔
- عشق و عاشقی صرف ایک ہی مرتبہ کرتا ہے، دوسری مرتبہ عیاشی اور اس کے بعد نری بدمعاشی۔
- قبر کھودنے والا ہر میت پر آنسو بہانے بیٹھ جائے تو روتے روتے اندھا ہو جائے۔
- خون، مشک، عشق اور ناجائز دولت کی طرح عمر بھی چھپائے نہیں چھپتی۔
- تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے، مداری کی ڈگڈگی سے نہیں۔
- لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔
- نام میں کیا رکھا ہے؟ دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں، گلوں ہی کی خوشبو آئے گی۔
- جس بات کو کہنے والے اور سننے والے دونوں ہی جھوٹ سمجھیں اس کا گناہ نہیں ہوتا۔
- یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹا نہ جا سکے۔

◆◆◆

اردو صحافت کا ارتقا

اردو صحافت نے ارتقاء کا عمل کن مراحل سے گزر کر پورا کیا ہے اور اس کے صحافیوں نے اپنی جفاکشی، محنت اور جدوجہد سے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش ثبت کیے ہیں یہ کتاب دراصل اسی کا ایک مبسوط خاکہ ہے جس میں دو صدیوں پر محیط اردو صحافت کے تاریخی، فنّی اور تکنیکی ارتقاء کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف: معصوم مرادآبادی صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی